محمد یوسف

استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ میاں محمد نواز شریف کالج، سرگودھا

ڈاکٹر محمد افضال بٹ

صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

رشید امجد کے افسانوں میں سسکتی انسانیت کا تذکرہ

Muhammad Yousaf

Assistant Professor Department of Urdu Govt Mian Muhammad Nawaz Shrif College, Sargodha.

Dr. Muhammad Afzal Butt

Chairperson Department of Urdu GC Women University, Sialkot.

Expression of Sobbing Humanity in Fiction of Rasheed Amjad

Rasheed Amjid is an awakened brain fiction writer. Reading his stories, one realizes that he is familiar with every vein of society like a pulse expert. He has told in his stories that Allah has sent man as a noble creature and has imposed responsibilities on him according to his status. But the rapid scientific progress has deprived man of his basic qualities. The spirit of self-sacrifice and service to human beings is disappearing. In this age of mechanization, all the schools are also producing a generation that is a conqueror of speech but has no character. All institutions have become a story of decline. The sighs, sobs and cries of the poor are being heard from all sides. This social decline has licked this seemingly beautiful society like a termite from within. Rashid Amjid wants to rectify this situation. The lamentations of dead humanity written by Rasheed Amjid are covered in this article.

Keywords: *Fiction, Pulse expert, Mechanization, Conqueror of Speech, Decline, Sighs, Sobs, Selfishness, Human feet, Lamentations.*

رشید امجد جدید اردو افسانہ نگاروں میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ رشید امجد نے جدید اردو افسانے کو اعتبار عطا کیا تو بے جا نہ ہو گا۔ جب زبان الفاظ کا گلیشیر بن گئی تو رشید امجد اور دیگر جدید افسانہ نگاروں نے اپنی

کہانیوں میں ان الفاظ کو علامتی انداز میں استعمال کر کے انھیں نئے مفاہیم عطا کیے۔ جس سے اردو افسانے کو نئی زندگی اور نیا انداز نصیب ہوا۔ رشید امجد وہ شخصیت ہیں جنھوں نے زندگی کے نشیب و فراز کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کا تجزیہ کیا۔ ان تجربات کا عکس ان کے افسانوں میں جھلکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جہاں اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا وہاں اس پر بھاری ذمہ داریاں بھی ڈالیں۔ لیکن برق رفتار سائنسی ترقی نے انسان سے وہ بنیادی انسانی صفات چھیں لیں اور وہ آہستہ آہستہ اپنے مقام سے گرتا چلا گیا۔ اگر ہندوستان کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے جب حکمران بے راہ روی کا شکار ہو جائیں تو اس کا براہ راست اثر عوام پر پڑتا ہے اور یوں معاشرہ تیزی سے رو بزوال ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بھی ایسا ہی ہوا۔ آخری مغل دور حکومت میں حکمرانوں نے بنیادی انسانی اخلاقیات کی وہ دھجیاں اڑائیں کہ جن کا تذکرہ ناگفتہ بہ ہے۔ پھر انگریزوں نے اپنی حکومت قائم کر کے انسانیت کا وہ استحصال کیا کہ خود انسانیت اس پر شرمندہ ہے۔ رہی سہی کسر تقسیم ہند نے نکال دی۔ ہندو سکھ اور مسلمان سب ہی انسانیت سوزی میں برابر کے شریک رہے۔ جس بے دردی سے لوٹ مار اور عزت دری کی گئی، انسانوں کے گلے کاٹے گئے اور جس طرح انسانیت سسکتی اور دم توڑتی رہی وہ تاریخ کا حصہ ہے۔

اگر بات یہاں ہی ختم ہو جاتی تو بھی بھرم رہ جاتا۔ قیام پاکستان کے بعد طویل عرصہ عوام منتظر رہی کہ کیے گئے وعدوں کے مطابق عوامی فلاح کے کام کیے جائیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور عوام کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ قائداعظم کی وفات کے بعد گورے انگریزوں کی جگہ کالے انگریزوں نے لے لی اور عوام ابتری کا شکار ہوتے گئے۔ سیاستدانوں سے مایوس ہو کر عوام نے فوج سے امید لگائی لیکن وہاں سے بھی مایوسی کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ رہی سہی کسر سائنسی ترقی نے نکال دی۔ جدید ایجادات نے انسان کو فرصت دینے کی بجائے مادیت پرست بنا دیا اور وہ دولت کی تلاش میں سرگرداں نظر آنے لگا۔ یہ وہ بنیادی وجوہات تھیں جنھوں نے اس خطے کے انسانوں کو اخلاقی زوال کا شکار کیا اور انسان اپنے مسائل کا شکار ہو کر ہمدردی، احترام، رحم دلی، احساس اور انسانوں کی دستگیری کی بنیادی صفات سے خالی ہو گیا۔

ڈاکٹر رشید امجد ایک حساس انسان ہیں۔ ان کا ماضی کے ساتھ ایک مضبوط رشتہ ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں موجودہ اقدار کا موازنہ ماضی کی خوب صورت اقدار سے بھی کرتے ہیں۔ انسانیت دوستی ان کی بنیادی صفت ہے۔ اس لیے انھوں نے جہاں جہاں انسانیت کو روبزوال دیکھا ہے وہیں سسکتی انسانیت کے نوحے تحریر کیے ہیں۔ مندرجہ بالا حالات کے نتیجے میں انسان کے باطن میں جو توڑ پھوڑ ہوئی ہے اس کا تذکرہ رشید امجد کے افسانوں میں موجود ہے۔ اس ضمن میں منشایاد تحریر کرتے ہیں۔

"ان کے افسانوں میں اپنے عہد کا دل دھڑکتا ہے۔ انھوں نے اپنے عصر کے سیاسی، سماجی اور خارجی معاملات و مسائل کے ساتھ ساتھ انسان کی باطنی دنیا میں ہونے والی توڑ پھوڑ اورآشوب کو بھی اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔"(۱)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو رشید امجد کے افسانوں میں سسکتی انسانیت کا اظہار بڑے واضح انداز میں نظر آتا ہے۔ یہ اظہار ان کے ہاں درسی نہیں بلکہ ان کی اپنی زندگی کے تجربات کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے جس معاشرے میں زندگی گزاری ہے اس کی ثقافت، سماج اور اس معاشرے کے لوگوں کے رویوں سے وہ خاص واقفیت رکھتے ہیں۔ بدلتی ہوئی اقدار نے معاشرے کو جس گھٹن اورافراتفری کا شکار کیا ہے اور جس میں پڑ کر انسان خود سے ہی بیگانہ ہو گیا ہے، رشید امجد کی ان اقدار پر گہری نظر ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں اپنی نفسیاتی بافت اور ذہنی تشکیل کے عوامل کا تجزیہ اس انداز سے کیا ہے کہ ان کے افسانے ان کی ذات کے ساتھ ساتھ سماج کا اظہاریہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ یوں ان کے افسانے سماجی ابتری کو بالخصوص نمایاں کرتے ہیں۔ سماجی ابتری کو نمایاں کرتے وقت انہوں نے سماج کے تمام طبقات کے تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھا ہے۔ وہ کسی ایک طبقے کے نمائندہ بن کر نہیں ابھرے کہ وہ خاص طبقہ ہی ان کی پہچان بن جائے بلکہ انھوں نے سماج کو دیکھا ہے اور سماج میں سے ہی اپنی تخلیقات کے موضوعات کشید کیے ہیں۔ انسان کی پریشانی کے اسباب تلاش کرنا اور پھر انھیں اپنے مخصوص انداز میں پرکھنا اور نتائج حاصل کرنا رشید امجد کا خاص وصف ہے۔ وہ چیزوں کو محض ان کے ظاہر سے ہی نہیں دیکھتے بلکہ ان کے باطن میں جھانک کر ان کی اصلیت تک رسائی حاصل کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے فن میں پختگی اور جاذبیت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔

انسانی تاریخ ایثار و قربانی سے بھری پڑی ہے۔ انسان کی معراج ہی انسان کے کام آنا ہے۔ ماضی کا انسان کے پاس علم حاصل کرنے کے موجودہ رسمی و غیر رسمی ذرائع نہ تھے اس لیے وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ ایسے لوگ نہ ہونے کے برابر تھے جو قرآن کا فہم رکھتے تھے۔ لیکن ان کا اندر روشن تھا۔ انھوں نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور انسانی اخلاقیات کی ان بلندیوں کو چھوا کہ آج کا انسان ان کی اخلاقی حیثیت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر ہم بزرگوں کے پاس بیٹھیں تو وہ ہمیں ایثار و قربانی کے وہ قصے سناتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اگر ماضی کے انسان کو دیکھیں تو اس کے پاس وسائل نہیں تھے اور وہ مشکل سے اپنی ضروریات پوری کرتا تھا۔ لیکن اس کے اندر ایک جذبہ دکھائی دیتا تھا وہ اپنی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے دوسروں کی ضروریات پوری کرتا تھا۔ ماضی کے انسان کے اندر خوف خدا تھا اوراس نے محسن انسانیت ﷺ کی تعلیمات کو فراموش نہیں کیا تھا. لیکن آج کے انسان نے نہ صرف ان تعلیمات کو بلکہ ترقی کے اشتیاق میں اپنے مقام اور مرتبے تک کو فراموش کر دیا ہے۔ اس اشتیاق میں اس کا تعلق اپنی ماں دھرتی سے کٹتا جا رہا ہے۔ اسی بے زمینی کی فضا کی تہہ میں دراصل انسان کی اپنی اصل سے دوری ہے اور اس دوری کا نتیجہ اب

اس صورت میں سامنے آرہا ہے کہ وہ انسان جو اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب بن کر اترا تھا اب اسے اپنا ہونا یا نہ ہونا برابر محسوس ہو رہا ہے۔ یہ خود فراموشی اور اپنی حیثیت کو نظر انداز کرنے کی وہ انتہا ہے جو بدلتی ہوئی اقدار کی چکا چوند میں پڑ کر انسان نے حاصل کی اس چکا چوند نے اس کی آنکھوں کو تو خیرہ کر دیا لیکن اس کا دامن خالی کا خالی ہی رہ گیا اور وہ عرفانِ انسان کے ساتھ ساتھ عرفانِ ذات سے بھی بیگانہ ہوتا چلا گیا۔ اور اب اکیسویں صدی جسے ترقی اور ایجادات کی تیز ترین صدی کہا جانے لگا ہے اس میں نفسا نفسی کی کیفیت ہے اور انسانی اخلاقیات اور معاشرتی صورت حال اس حد تک گر چکی ہے کہ انسان کے مقام و مرتبے پر بد گمانی ہونے لگتی ہے۔

"یہ پہلی بار ہے، وہ مجھے اکیلا چھوڑ گئی ہے۔
اکیسویں صدی جو ہے۔
آنے والے نے بیگ اٹھاتے ہوئے مڑ کر کہا، اس نے شاید اس کی بات سن لی تھی۔
"اکیسویں صدی اس نے دہرایا۔"
"جی سر... میری ماں کہتی ہے کہ اس نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ اکیسویں صدی میں کوئی کسی کو نہیں پہچانے گا... بس ایک نفسا نفسی ہو گی۔"(۲)

یہ وہ اذیت ناک صورت حال ہے جو موجودہ اقدار نے اس سماج کو تحفے میں دی ہے۔ ایجادات کی صدی نے انسانی رشتوں کو اس قدر کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے کہ کوئی کسی پر اعتبار کرنے کو تیار ہے نہ کسی کا دکھ بانٹنے کا ہنر جانتا ہے۔ تمام تعلقات اور رشتے ناتے ذاتی مفاد سے شروع ہو کر ذاتی مفاد پہ ہی ختم ہو رہے ہیں۔ ہر آدمی دوسرے کو دھکا دے کر آگے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہر طرف تباہی اور بد حالی کا دور دورہ ہے اور بجائے ملال و احساس کے لوگ اس تباہی پر سفاکانہ قہقہے لگا رہے ہیں۔ مسخ شدہ انسانیت کی یہ صورت حال معاشرے کے لیے بہت خطرناک ہے۔ اگر ہر فرد صرف اپنے مفاد کو ہی ترجیح دے گا تو معاشرے سے تمام مثبت اقدار آہستہ آہستہ ختم ہوتی جائیں گی اور بالآخر حالات یہاں تک پہنچ جائیں گے کہ معاشرے کی بقاء کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ اس انسانیت سوز صورت حال کی عکاسی رشید امجد کے ایک اور افسانے "پرانی آنکھوں سے دیکھنے کا آخری دن" میں بھی ملتی ہے جہاں کسی کو کسی کی کوئی پروا نہیں ہر کوئی اپنے مطلب کو پورا کرنے کا خواہش مند ہے اور اسی کوشش میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی سعی میں لگا ہوا ہے۔

"چمکتی دھوپ میں ہر شے کھلکھلا رہی تھی۔ اسے عجیب طرح کی طمانیت ہوئی۔ وہ فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ بہت ہی دھیمے سے جیسے چپکے چپکے ایک مایوسی اس کے اندر پھیلنے لگی... وہی دوڑ، ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے نکلنے کی جلدی، بے ہنگم، بے قابو

ٹریفک کی لائنیں، قانون شکنی، سفاکانہ قہقہے، ایک دوسرے کو دھتکارتے رویے... ہر شے سلگ رہی تھی لیکن کسی کو نہ دکھائی دیتی نہ آگ کی تپش محسوس ہوتی...وہ فٹ پاتھ کے ساتھ لگے جنگلے پر جھک گیا، ٹھنڈی سانس لی اور اپنے آپ سے کہنے لگا..." منظر جب تک واقعی نہ بدلے آنکھ بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا"(۳)

اور اس منظر کے بدلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی کیوں کہ یہ منظر خود ماضی کی شاندار روایات کو بدل کر پروان چڑھا ہے اور اب اس منظر نامے پر ابھرنے والے انسانوں کو ایک دوسرے سے کوئی رغبت نہیں۔ ہر کسی کے پیش نظر محض اپنا مفاد ہی ہے اور یہ مفاد پرستی ماضی کی شاندار اقدار سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ رشید امجد نے اپنے افسانوں میں ان بدلتی ہوئی اقدار کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلی کے اسباب اور نتائج بھی بڑے واضح انداز میں بیان کیے ہیں۔ یوں ان کے افسانے معاصر اردو میں خاص مقام و مرتبہ کے حامل قرار پاتے ہیں۔ رشید امجد نے سماج میں پھیلے اخلاقی زوال اور معاشرتی ناہمواریوں کو بڑے احسن انداز میں بیان کیا ہے۔ اخلاقی زوال کو دیکھتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آدمی تو زندہ ہیں لیکن ان کے ضمیر دفن ہو چکے ہیں۔ ضمیر فروشوں کے اس شہر میں باضمیر لوگوں کا زندہ رہنا کتنا مشکل ہے؟ رشتے اور تعلقات کن بنیادوں پر قائم کیے جاتے ہیں ملاحظہ فرمائیے:

"یہی کہ تم اچھے آدمی ہو مگر۔۔۔۔

مگر کیا؟

وہ ہنسی یہ کہ ضرورت سے زیادہ اچھے اور۔۔۔۔۔

اور ایسے لوگ تمھارے ڈیڈی کو پسند نہیں

ہاں اس نے سر ہلایا۔

اور تمھیں۔

وہ کچھ دیر ناخن سے ناخن کھرچتی رہی پھر آہستہ آہستہ، بہت ہی آہستہ سے بولی۔ میں بھی تو اسی دنیا میں رہتی ہوں۔

گھنی سیاہ رات سارے جنگل میں پھیل گئی۔ گہرے گھپ اندھیرے میں وہ سر سے پاؤں تک بھیگ گیا۔"(۴)

رشید امجد نے اپنے افسانوں میں انسانی ابتری کے اس پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے کہ انسان ایک فضول دوڑ میں بھاگا جا رہا ہے اور دوسروں سے سبقت حاصل کرنے کا متمنی ہے لیکن جب وہ دوڑتے دوڑتے تھک جاتا

ہے اور بظاہر منزل پر پہنچ جاتا ہے تو پیچھے مڑ کر دیکھنے سے اسے یہ احساس گھیر لیتا ہے کہ یہ تو سارا سفر ہی رائیگاں گیا۔بظاہر تو وہ ترقی کی دھن میں مست دنیا کی اس شاہراہ پر سرپٹ دوڑے جارہا ہے اوراور دنیا سمیٹنے کی خواہش نے اسے اچھے برے کی فکر سے بھی آزاد کر دیا ہے۔ لیکن جب منزل پر پہنچ کر غور کرتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کی تو سمت ہی درست نہیں تھی۔اس سفر میں اسے حاصل تو کچھ نہیں ہوا ہاں جو تھا وہ ضرور کھو دیا ہے۔ رشید امجد نے اپنے افسانوں میں بارہا اس رنج کا اظہار کیا ہے کہ بحیثیت مجموعی اس معاشرے کی انسانیت دفن ہو چکی ہے۔ انسان سے سوچنے سمجھنے اور دوسروں کی باتوں کو درخور اعتنا سمجھنے کی روش ختم ہوتی جارہی ہے۔وہ اپنے افسانے'' ایک مرحوم کی یاد میں'' میں مردہ انسانیت کا نوحہ اس طرح تحریر کرتے ہیں۔

"اس شہر کے لوگوں کے ساتھ بھی شاید یہی معاملہ ہے"۔ چوتھا درویش فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔"یہ لوگ خود کو زندہ سمجھتے ہیں لیکن اصل میں کھنڈر ہیں۔ کھنڈر ہی کھنڈر۔"
"آنکھیں اور کان بند ہوں اور پھر دیکھنے سننے کا دعویٰ کیا جائے۔ پہلا درویش کہنے لگا۔"تو پھر یہی ہوتا ہے جو اس شہر کے ساتھ ہو رہا ہے۔"(۵)

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت زندگی کی علامت ہے جب وہ ہی چھن جائے تو زندگی اور موت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا اور زندگی اپنا اصل رنگ ڈھنگ کھو دیتی ہے۔ زندگی کی اصلیت کے کھونے کا احساس بھی ان لوگوں کو ہوتا ہے جو ادراک رکھتے ہوں یعنی زندہ ہوں اور ان لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کو احساس زیاں ہی نہیں ہے۔ مردہ انسانیت کی اس کیفیت کو رشید امجد نے یوں بیان کیا ہے:

"بزرگ مسکرائے۔"یہ پیوند کاری باہر ہوئی ہے۔ ہر خیال، ہر روایت، بلکہ پورے نظام میں اتنی پیوند کاری ہو چکی ہے کہ ان کی اصلیت ہی باقی نہیں رہی۔ ہر شے خود مختار ہو چکی ہے۔"
وہ کچھ دیر چپ رہے، پھر بولے،"تم پر جو بیت رہی ہے وہ سب پر گزر رہی ہے۔ تمہیں اس کا ادراک اس لیے ہو رہا ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو۔"
تو باقی سارے۔۔۔"جملہ نامکمل رہ گیا۔"(۶)

وقت کے بدلتے دھارے نے انسان کو مجبوریوں کی اس شاہراہ پر لا کھڑا کیا ہے کہ اب اس کے پاس سوچ کا بھی اختیار باقی نہیں رہا۔ یہ اختیار ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ'' گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے تیرا''۔ درس گاہیں جو انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے مالا مال کرتی ہیں وہاں بھی انسانیت کے زوال کی داستان رقم کی جارہی ہے۔ شاعر مشرق کی طرح رشید امجد کو بھی اس بات کا قلق ہے کہ جہاں قوم کی تعمیر ہونا تھی وہاں زوال کی بنیادیں رکھی جارہی ہیں۔ رشید

امجد نوحہ کناں ہیں کہ جب ان درس گاہوں سے نکلنے والی نسل محض نصاب کو یاد کرنے والے ہی ہو گی تو ان میں سے مفکر کہاں سے نکلیں گے اور سماجی و ثقافتی اقدار کی آبیاری کیسے ممکن ہو پائے گی۔ اکثر لوگوں کے پاس ڈگریاں تو بڑی بڑی ہیں لیکن علم نہیں ہے۔ نسل نو کے نوجوان گفتار کے غازی تو ہیں لیکن کردار کی نعمت سے محروم ہیں۔ نتیجے کے طور پر ایسی نسل تیار ہو رہی ہے جو عملی طور پر ملک و قوم کے لیے مفید ہونے کی بجائے زہر قاتل ثابت ہو رہی ہے۔ ہر طرف طوطے تیار کرنے کا عمل جاری ہے۔ ان حالات میں تو یقیناً ہر طرف سے یہی صدا بلند ہو گی کہ ''میں غلام ابنِ غلام ابنِ غلام حاضر ہوں'' (بنجر لہو منظر) اس کیفیت کی عکاسی رشید امجد نے اپنے افسانے "دل زندہ رہے" میں اس طرح کی ہے۔

> "شہر کی درس گاہوں،گھروں اور محفلوں میں طوطے بنانے کا کام تیزی سے ہو رہا ہے۔ ریڈیو ،ٹی وی، اخبار ،رسالے اور درسی کتابیں سب اس کام میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔۔۔۔ایک ہی عمل۔۔۔۔طوطے بنانے کا عمل برسوں سے جاری ہے، صرف کنٹرول کرنے والے کی آواز اور چہرہ بدلتا ہے۔"(۷)

رشید امجد کے افسانوں میں انسانیت کے زوال پر مبنی جو داستانیں رقم کی گئی ہیں اور ان میں سیاسی، سماجی اور ثقافتی زوال کا جو تذکرہ ملتا ہے یہ ان کا ذاتی تجربہ ہے۔ وہ جس سماج میں رہ رہے ہیں اس کے رویوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ سماج کے دیگر اکثر لوگوں کی طرح ظلم اور غلطیوں پر آنکھیں بند کر کے نہیں بیٹھتے بلکہ علی الاعلان وہ انہیں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ رشید امجد ایک سچے فنکار کی حیثت سے سامنے آتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ذاتی پسند اور نا پسند کو اپنی تحریروں پر غالب نہیں ہونے دیتے اور شخصیت پرستی ان کی سرشت میں شامل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی اعلیٰ اقدار کو روندا گیا، اس کا تذکرہ بلا تفریق ان کی کہانیانیوں میں موجود ہے۔ رشید امجد جمہوریت پسند ہیں لیکن جہاں بھی دیگر صاحب اختیار افراد کی طرح سیاست دانوں نے اخلاق کے پرخچے اڑائے ہیں رشید امجد نے بلا تفریق اس زبوں حالی کا تذکرہ اپنی کہانیوں میں کیا ہے۔ غرض ان کی کہانیوں میں زندگی کے زیر و بم کی مکمل تصویر کشی ملتی ہے۔ ان کی اس خوبی کے بارے میں ڈاکٹر نوازش علی رقمطراز ہیں:

> "رشید امجد اپنے افسانوں میں حال کی بے معنویت، اپنے تشخص کی تلاش، یقین و بے یقینی ،ہے اور نہیں ہے کے درمیان ان کا رہنا، عمل اور بے عملی، ہونے نہ ہونے کی پکار، دنیا داری اور درویشی کے درمیان کشمکش، متضاد عناصر کا باہم دست و گریباں ہونا، بے چہرگی کا ملال ، سیاسی و سماجی و تاریخی جبر، ظلم و خوف ، حالات کی بے رخی ،احساس شکست،

اجنبیت، بے معنویت، عصری حسیت اور جدید زندگی کی پیچیدگیوں کے بارے میں کئی ایک زاویوں اور گوشوں سے بیک وقت سوچنے کے عمل سے گزرتا ہے۔"(۸)

یہی تجربہ اور سیاسی سمجھ بوجھ رشید امجد کو بڑے افسانہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ رشید امجد ہوا میں قلعے تعمیر نہیں کرتے بلکہ جیتے جاگتے معاشرے میں جو ناہمواریاں بدلتی ہوئی اقدار نے پیدا کی ہیں وہ ان کو اسی معاشرے میں رہتے ہوئے محسوس کرتے ہیں اور اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ معاشرے کو ایسے نقصان سے بروقت آگاہ کرنا چاہتے ہیں جس کی طرف معاشرہ دھیرے دھیرے غیر محسوس انداز میں جدت کی آڑ میں بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن رونا اس بات کا ہے کہ زوال کے اس سفر کا کسی کو احساس بھی نہیں ہے۔ معاشرے کی مجموعی حالت دیکھنے سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دیکھنے، سننے اور سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ختم ہو چکی ہیں۔

"خبر کے لیے آنکھوں، حساس کانوں اور جاگتے ذہنوں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تینوں حسیں اب ان سے رخصت ہو چکی تھیں۔ سیاح کو کچھ سمجھ نہ آرہا تھا کہ کیا کرے۔ شہر والوں کو خبردار کرنا بے کار تھا، وہ خبردار ہونا ہی نہیں چاہتے تھے، شہر سے نکل جانے کا بھی اب وقت نہیں رہا تھا کہ فصیل کے سارے دروازے بند ہو گئے تھے۔"(۹)

ترقی یافتہ انسان نے معاشرے کو جس اجتماعی بدحالی کا شکار کیا ہے رشید امجد کے بعض افسانوں میں ان کا بڑا واضح انداز میں اظہار ہوا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اب اقدار اس حد تک تبدیل ہو چکی ہیں کہ اب معاشرے میں ایماندار لوگوں کی قدر و قیمت کرنے کی بجائے انھیں بے وقوف تصور کیا جاتا ہے۔ معاشرے میں ایسے ایماندار لوگ بھی نظر آجاتے ہیں جو اپنا کام نہ صرف محنت اور ایمان داری سے سرانجام دیتے ہیں بلکہ بے ایمانی اور کام چوری ان کی سرشت میں شامل ہی نہیں ہوتی۔ اگرچہ اس طرز کے لوگوں کی تعداد کم ہے اور شاید انہی نایاب لوگوں کی وجہ سے اس دنیا کا بھرم قائم ہے۔ لیکن جب معاشرہ ان لوگوں کی قدر نہیں کرتا تو وہ لوگ بھی مایوس ہو جاتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو اپنا کام کرنے کی بجائے سارا دن سیاست اور دیگر غیر متعلقہ موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں، درازیں بھرتے ہیں اور شام کو اپنے افسر کو حصہ دے کر گھر چلے جاتے ہیں افسر وقت ان کی تو خوب عزت کرتے ہیں اور وہ جو سارا دن سر جھکائے اپنے کام میں محو رہتے ہیں ان کی ذرا برابر عزت نہیں ہوتی۔ اچھائی اور برائی میں کچھ فرق تو ہونا چاہیے۔ مطلبی اور مفاد پرست خوشامدی لوگوں کی ہی کیوں عزت ہے؟ اور ترقی تو سنیارٹی پر ہونی ہے نہ کہ اہلیت پر، ایک لائن ہے جس میں گدھے اور گھوڑے سب برابر ہیں۔ یہ وہ حالات ہیں جو محنتی اور ایمان دار لوگوں کو مایوسی کی دلدل میں دھکیل دیتے ہیں اور یہ برائی معاشرے کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے کہ اب مخلص لوگ نایاب

ہوتے جارہے ہیں۔ سسکتی انسانیت کی اس کیفیت کو رشید امجد نے اپنے افسانے "جاتی رت کے خواب" میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"گدھے گھوڑے میں جب کوئی فرق ہی نہیں تو گھوڑا بننے کی کیا ضرورت ہے؟ سوچتا اور دیکھتا کہ گدھے کیسے دندناتے پھر رہے ہیں۔
میں شاید گدھا ہوں نہ گھوڑا۔ یہ خیال اس کے سارے وجود کو ادھیڑ کر رکھ دیتا۔" یہ میرے ساتھ زندگی بھر ہوتا کیا رہا ہے؟"(۱۰)

رشید امجد گہری بصیرت کے حامل افسانہ نگار ہیں، ان کے افسانے سماجی ابتری کو بڑے موثر انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ، انھوں نے واضح اور واشگاف الفاظ میں معاشرے کے تمام افراد کے ساتھ ساتھ مختلف اداروں میں ہونے والی خرافات اور بدعنوانی کو بھی اجاگر کیا ہے۔ سماج کی تشکیل میں اس کے اداروں کا بڑا اہم عمل دخل ہوتا ہے۔ اگر مختلف سماجی ادارے اپنی حدود و قیود سے باہر نکل جائیں اور بدعنوانی ان میں سرایت کر جائے تو سماج کا شیرازہ بکھر جاتا ہے جسے مصلحت کے نام پر مختلف لبادوں میں چھپایا تو جا سکتا ہے لیکن اس کے مضمرات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ یہ مضمرات سماج کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹتے چلے جاتے ہیں اور آخر کار ایک خاص مقام پر پہنچ کر اس سماج کے باشندگان اپنی پہچان بھی کھو دیتے ہیں، ان کا مطمع نظر صرف اور صرف ذاتی لذت و تسکین رہ جاتا ہے اور انھیں یہ بھی نہیں پتا چلتا کہ یہ سب کچھ کیوں اور کس کے لیے کر رہے ہیں۔

تمام افراد کو اگر ایک لڑی میں پرو دیں تو معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ ایک عام کلرک سے لے کر چیف سیکرٹری تک اگر سب لوگ ایمانداری سے اپنے فرائض سر انجام نہ دیں تو ملک ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتا۔ بد دیانتی کی وبا اوپر سے نیچے آئے یا نیچے سے اوپر جائے بہر حال نقصان ریاست کا ہی ہوتا ہے۔ دیکھا دیکھی تمام ملازمین کو بد دیانتی کی لت لگ جاتی ہے اور ریاست زوال کی سمت سرپٹ دوڑنے لگتی ہے۔ رشوت نے جس طرح اداروں کو تباہ کیا ہے اور نتیجے میں معاشرے کو کھوکھلا کیا ہے اس کا نوحہ رشید امجد نے اپنے افسانوں میں کئی جگہ تحریر کیا ہے۔ دراصل قیام پاکستان سے اب تک زوال کا تسلسل جاری ہے۔ قائد اعظم کے بعد کوئی بھی ایسا محب وطن لیڈر پیدا نہیں ہو سکا جو اپنے مفاد کے حصار سے نکل کے ملک و قوم کے مفاد کے لیے کوئی ناقابل فراموش خدمات سر انجام دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ تباہی و بربادی نے پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ بالخصوص پولیس کا محکمہ معاشرے کی مجموعی صورت حال میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے لیکن یہ محکمہ قیام پاکستان سے اب تک صرف بادشاہ وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں استعمال کر رہا ہے۔ تھانے کچہری میں کسی بھی معزز شہری کی عزت اتار لی جاتی ہے۔ جائز کام کے لیے بھی رشوت کا مطالبہ ہے۔ اس صورت حال کو رشید امجد نے اپنے افسانے "متلاہٹ" میں بیان کیا ہے۔

پولیس ایک معزز شہری کو اس جرم میں پکڑ لیتی ہے کہ وہ ایک ایس ایچ او کے سامنے اپنے حقوق کے لیے زبان کھولتا ہے جس کا کہ شاید اسے اس معاشرے میں حق حاصل نہیں ہے۔ اپنی عزت نفس کا تحفظ اس کا جرم بن جاتا ہے اور تھانے میں اس کی خوب تضحیک کی جاتی ہے یہاں تک کہ گھر میں یہ اطلاع دینے کے لیے کہ وہ تھانے میں بند ہے اس سے رشوت طلب کی جاتی ہے۔ رشید امجد نے اپنے افسانے میں اس ملک کے قانون کے رکھوالوں کو اس طرح بے نقاب کیا ہے۔

"کسی کو اطلاع بھیجنی ہے یا یہیں رہنا ہے۔

میں نے خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

تو پھر جیب میں ہاتھ ڈالو نا۔

میں نے مکینکی انداز سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس نے جھپٹ کر بٹوہ میرے ہاتھ سے چھین لیا..... اس نے سر ہلایا..... فکر نہ کرو صبح ہوتے ہی خبر ہو جائے گی۔"(۱۱)

جب محافظ ہی راہزن بن جائیں تو عام شہری کس کے پاس فریاد لے کر جائیں۔ وہ ادارے جن کا کام عام لوگوں کو تحفظ دینا اور ان کی جان مال اور عزت کی حفاظت کرنا ہے اگر کام کرنا ہی چھوڑ دیں بلکہ عوام کی تذلیل پر اتر آئیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا معاشرہ تیزی سے ان اخلاقی اقدار سے محروم ہو رہا ہے جو ہمارے بزرگوں کا خاصا تھیں۔ اداروں کی تباہی اور بربادی کا یہ حال ہے کہ روزانہ لاکھوں لوگ دفاتر میں ذلیل و خوار ہوتے ہیں لیکن ان کے جائز کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتے۔ ان جائز کاموں کے لیے انھیں رشوت دینی پڑتی ہے یا پھر سفارش پیش کرنا ہوتی ہے جو ایسا نہیں کر سکتے وہ مسلسل کرب کی کیفیت سے گزرتے ہیں۔ رشید امجد نے اپنے افسانوں میں ایسے کئی کرداروں کو ان بے حس اداروں میں ذلیل ہوتے دکھایا ہے۔ اصلاحات کے بلند و نانگ دعوؤں کے باوجود پولیس و عدالتی نظام سمیت کہیں بھی بہتری نظر نہیں آتی۔ اپنے افسانے "متلاہٹ" میں رشید امجد اس سسکتی بلکتی کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"میں تو اسی رات مر گیا تھا۔ تھانے ہی میں اسی بینچ پر بیٹھے بیٹھے، حرکت قلب بند ہو جانے سے۔

خاموشی گہری ہو گئی۔

وہ چپ خلاء میں کسی نامعلوم شے کو گھورے جا رہا تھا..... گھورے ہی جا رہا تھا۔

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ یہاں تو آدھے سے زیادہ شہر اس طرح بنچوں پر بیٹھے بیٹھے مر چکا ہے اور....."(۱۲)

اداروں کی مجموعی صورت حال اتنی خراب ہو چکی ہے کہ یہ ادارے عوام کے لیے وبال جان بن گئے ہیں۔ عوامی نمائندوں کی یہ ذمہ داری تھی کہ ان بے لگام اداروں کو لگام ڈال کر عوام کے لیے تسکین پیدا کرتے لیکن یہاں تو گنگا ہی الٹی بہہ رہی ہے عوامی نمائندے بھی ان اداروں کے ساتھ مل کر عوام کا خون چوسنے میں مصروف ہیں۔ عوامی

نمائندوں اور اداروں نے آپس میں گٹھ جوڑ کر لیا ہے اور عوام نے حالات کے ساتھ سمجھوتا۔ رہبر جنہیں عوام اپنے ووٹوں کے ذریعے پارلیمان تک پہنچاتے ہیں وہی رہبر راہزن بن جاتے ہیں۔ عام لوگوں کی کیفیت تو کچھ ایسی ہے۔

راہزنوں سے تو بچ ہی نکلا تھا
اب مجھے رہبروں نے گھیرا ہے

حالات یہ ہیں کہ دن بھر لوگوں کی جیبیں کاٹ کر دراز بھرے جاتے ہیں اور شام کو انھیں تقسیم کر لیا جاتا ہے جس میں سے افسران بھی اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ وہ لوگ جنہیں اس بات کا احساس ہے کہ یہ غلط کام ہے، وہ بھی لوگوں کی دیکھا دیکھی اس گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں اور ساتھ بخشش کے بھی خواہش مند ہیں۔

"اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگتی۔" میرا ظرف کیا ہے" سارا دن میز کی درازیں
بھرتے جانا اور چھٹی کے وقت حساب کر کے اپنے افسر کو اس کا حصہ دینا اور۔
وہ جھنجھلا جاتا۔ "کام تو میں یہ کرتا ہوں اور تمنا ہے سرمئی دروازے سے اندر جانے کی"
مرشد تسلی دیتا۔ "چلو تمنا تو ہے نا، دوسروں میں تو یہ بھی نہیں"[۱۳]

یہ اقتباس تو یہی ظاہر کرتا ہے کہ افراد معاشرہ ایمان کے آخری درجے کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ انھیں برائی کا احساس تو ہے لیکن اس کے باوجود وہ برائی کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور اس بدعنوان معاشرے کا کل پرزہ ہیں۔ وہ رائج دستور کے مطابق ہی اپنی حیات بسر کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کے افراد جب اپنے مرشد سے اپنے ضمیر کی کیفیت کا ذکر کرتے ہیں تو وہ انھیں تسلی دیتا ہے کہ آپ باقی لوگوں سے بہتر ہو کیوں کہ بہت سے لوگوں کو تو اچھائی اور برائی کی تمیز تک باقی نہیں رہی تمہیں کم از کم یہ شعور تو ہے۔ افسانہ نگار نے اپنے اس افسانے میں معاشرے کے اخلاقی زوال کا نوحہ تحریر کیا ہے۔ ان لوگوں کا نوحہ جو زوال کی آخری سیڑھی اترتے ہوئے بھی مطمئن ہیں۔

جب سماج اس حد تک بدحالی کا شکار ہو جاتا ہے تو جنگ جو کہ ملک اور قوم کی حفاظت کے لیے لڑی جاتی ہے اس کے مقاصد بھی تبدیل ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور جنگ کے سپاہی ملکی سالمیت اور عوام کی خوش حالی اور بقاء کے ساتھ ساتھ اپنے تشخص کی بحالی کے جذبے سے سرشار ہو کر جنگ میں حصہ لینے کی بجائے محض لذت و جنسی تسکین کو سامنے رکھنے لگتے ہیں۔ یہ امر جب واقع ہوتا ہے تو جنگ میں مخبری کے اہم کام پر مامور افراد بھی مخالف کی جنگی چالوں اور جنگی حکمت عملیوں کی مخبری کرنے کی بجائے وہاں کی عورتوں سے تسکین حاصل کرنے اور پھر واپس آ کر دوسروں کو جوش دلانے کے لیے بیان کرنے لگتے ہیں یوں جنگ تو جاری رہتی ہے لیکن اس کے اصل مقاصد پس پردہ چلے جاتے ہیں۔ رشید امجد کے افسانوں میں اس بے راہ روی کی خوب عکاسی ملتی ہے۔ وہ سماج کے تمام عناصر پر گہری نظر رکھتے ہیں اور انہوں نے تمام عناصر کے نفسیاتی تجزیے بڑی مہارت سے پیش کیے ہیں۔

رشید امجد کے افسانوں کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ انتہائی سہل اور رواں انداز میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور افسانے کے اختتام پر قاری کو کسی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ قاری بڑی آسانی سے اصل بات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے اور اس بات کا ادراک بڑی آسانی سے کر لیتا ہے کہ جدیدیت کے نام پر ہونے والی ان خرافات کی جڑیں معاشرے کو کس طرح کھوکھلا کیے جا رہی ہیں۔ قدرت کا یہ اصول ہے کہ جب کوئی سماج نام نہاد تبدیلی کے نام پر ایسی خرافات کو رواج دیتا ہے جو سماج کے باشندوں کو فطرت اور فطری ہم آہنگی سے دور لے جاتی ہیں تو وہ سماج ابتری اور بدحالی کا شکار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب مادی مفادات کی اہمیت اخلاقی اور سماجی اقدار سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ جب اخلاقی اقدار گرنا شروع ہوتی ہیں اور ان کے مد مقابل مادی مفادات کے رویے بڑھنے شروع ہو جاتے ہیں تو معاشرے کے مختلف ادارے بھی اسی روش میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ زر، زن اور زمین کی اہمیت بڑھتی چلی جاتی ہے کیوں کہ جنسی لذت اور معاشی آسودگی فراہم ہونے لگتی ہے۔ رشید امجد نے اپنے افسانوں میں سماج میں سرایت کرتی ان تبدیلیوں کو بھی کھل کر بیاں کیا ہے جنہوں نے تمام اداروں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

> "ان کے مخبروں نے بتایا تھا کہ وہاں کی عورتیں خوب پلی ہوئی اور اٹھکیلیاں کرتی ہیں۔ مرد لالچ اور حسد کے حصار میں بند اپنے کاموں سے اس طرح چپک گئے ہیں کہ انہیں اپنے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ درس گاہوں میں کتاب کی بجائے ڈنڈے اور ہتھیار آ گئے ہیں۔ انصاف گاہوں میں عدل کی روایت ختم ہو گئی ہے اور منصف پیسے لے کر فیصلے کرتے ہیں۔ دربار میں باہمی مشاورت کی بجائے ایک دوسرے پر آوازیں کسی جاتی ہیں۔ خلیفہ لذتوں کے نشے میں سرشار ہے۔ اسے اپنے محل سے باہر کی دنیا کی کوئی خبر نہیں۔ عبادت گاہیں بحثوں کا اکھاڑہ بن گئی ہیں اور وہاں سے نفاق کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور وہاں کے لوگ، سب کچھ دیکھتے ہیں لیکن یوں بے نیازی سے شانے ہلاتے ہیں جیسے سب کچھ ان کے ساتھ نہیں کسی اور کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اپنا زوال ان کیلیے گفتگو کا پسندیدہ موضوع اور لذت کا ایک ذریعہ ہے۔"(۱۴)

یہ سماجی زوال مجموعی طور پر پورے معاشرے کو دیمک کی طرح کھاتا چلا جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ دیمک زدہ یہ سماج ظاہری طور پر تو بڑا خوش نما معلوم ہوتا ہے لیکن اندرونی طور پر اس میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا اور جب ظاہری خول اترتا ہے تو اندر سے سوائے حسرت اور ندامت کے کچھ بھی برآمد نہیں ہوتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ صاحبان اقتدار اور انصاف کی مسندوں پر براجمان افراد اپنے فرائض سے غافل ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور یہ غفلت اس حد تک بڑھ چکی ہوتی ہے کہ انصاف کرنے والے منصف بھی ذاتی مفادات کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ جب صورت حال

یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو پھر وہ سماج تباہی اور بربادی کی طرف گامزن ہو جاتا ہے کیوں کہ جس سماج سے انصاف اٹھ جاتا ہے اس میں ظلم عام ہو جاتا ہے، کسی مظلوم کو انصاف فراہم نہ کرنا بھی ایک بہت بڑا ظلم ہے جو معاشرے کی بنیادیں ہلا دیتا ہے۔ نظام عدل کا زوال ایک معاشرتی بحران بن کر سامنے کھڑا نظر آتا ہے، اس بحران کا شکار ہر وہ شخص ہے جو مظلوم ہے اور مظلوم کے ساتھ ساتھ نادار بھی ہے۔ ایسے معاشرے جہاں پیسے لے کر فیصلے کیے جاتے ہوں وہاں نادار کو انصاف ملنا محال ہے اور جب انصاف نہیں ملتا تو بے راہ روی جنم لیتی ہے۔ مظلوم اگر انصاف کے اداروں سے مایوس ہو کر خود اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو قانون شکنی لازمی ہو گی اور یہ قانون شکنی دیگر بہت سی برائیوں کو جنم دے گی یوں وہ معاشرہ ابتر صورت حال اختیار کرتا جائے گا۔ یہ ابتری ایک شخص تک نہیں رکتی بلکہ ہر آنے والا اس کو پھیلاتا ہی چلا جاتا ہے اور ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ اس نظام کے خلاف آواز اٹھانے کی بجائے معمول کی بات سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ معاشرتی ناہمواریوں کا یہ سلسلہ دراز تر ہوتا جا رہا ہے۔ ان معاشرتی ناہمواریوں نے جو مسائل پیدا کیے ہیں اس سے سب سے زیادہ متاثر قلیل تعداد میں موجود ایماندار ملازم طبقہ ہوا ہے۔ رشید امجد کے ہاں اس ایماندار طبقے کی سسکتی خواہشات کی عکاسی بڑے احسن انداز میں ملتی ہے۔

> "لیٹر تو جاری ہو گیا لیکن سارا دن کوئی اس کے اندر ضربیں لگاتا رہا۔ شام کو بیوی نے کہا، تمھاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس لیٹر کو جاری کرنے کے لیے بہت کچھ حاصل کر لیتا۔ تمھیں اگر اپنی نہیں تو بچوں کی ہی فکر کرنی چاہیے، اب ان کی یونیفارم کے چیتھڑے اترنے والے ہیں۔
>
> کون غلط ہے اور کون صحیح! سونے سے پہلے اس نے سوچا، فیصلہ کون کرے گا۔[۱۵]

رشید امجد انسان کی شناخت کے قائل ہیں۔ وہ سماج کے لیے انسان کو بنیادی عنصر گردانتے ہیں۔ سماجی ارتقاء انسان کا ہی ارتقاء ہے لیکن بدلتی ہوئی صورت حال نے انسان کی پہچان اس کے عہدہ تک محدود کر کے رکھ دی ہے۔ جونہی ایک عہدہ کا اختتام ہوتا ہے اس عہدے سے وابستہ انسانوں کی شناخت محض "مرحوم" کے نام سے رہ جاتی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مستقل طور پر معدوم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ زوال کا شکار اقدار میں وہ پہلے جیسی جاذبیت اور وسعت نظری معدوم ہو رہی ہے۔ وہ انسان جو عہدے کی تشکیل کرتا ہے ایک سماج کو عروج عطا کرتا ہے وہی سماج اس کی صلاحیتوں اور خدمات کے اعتراف کی بجائے اس کے عہدے سے غرض رکھتا ہے۔ گویا معاشرتی زوال انسانی زوال کا سبب بن چکا ہے۔

> "پھر زندگی کے ہنگامے اور پھیل گئے۔ اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے اس نے سوچ لیا..... اگر کہانی میرے پاس نہیں تو کیا ہوا۔ میری عزت میں تو اور اضافہ ہو گیا ہے۔

پہلے لوگ اسے کہانی کی وجہ سے بلاتے تھے، اب اس کے عہدے کی وجہ سے بلانے لگے تھے۔"(۱۶)

یوں جب انسان کی پہچان اس کی صلاحیتوں اور خدمات کی بجائے اس کے عہدے سے ہونے لگی تو ایک نئی کشمکش نے جنم لیا۔ انسان جو سماج کا نمائندہ تھا وہ کسی مشین کے کل پرزے کی طرح عہدے کی جستجو میں لگ گیا۔ انسان ایک عہدے سے دوسرے بہتر عہدے کی طرف کوشش کرتا نظر آتا ہے اور جب عہدہ حاصل کر لیتا ہے تو اس میں آگے بڑھنے کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ یوں عہدے کی جستجو انسان کی اپنی شناخت کو ختم کرنے کا موجب بنتی چلی جاتی ہے ۔ سماج میں بہتر عہدہ ہی بہتر زندگی کا معیار جب ٹھہرایا جانے لگا تو لامحالہ طور پر احساس مردہ اور ضمیر بے حس ہونے تھے۔ ایسا ہی ہوا مالی مفادات کی دوڑ نے انسان کو بے حس کر دیا۔ اور یہی بے حسی اس کی پہچان بھی اس سے چھین کر لے گئی۔ پہچان چھن جانے کا یہ عمل نہ صرف ایک فرد بلکہ معاشرے کے ساتھ رونما ہوا ہے۔

"یہ لوگ کون ہیں اور میں کہاں آگیا ہوں؟"..... وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے۔ سب لوگ پتھر کے ہو چکے ہیں کہ ان کے چہروں پر مایوسی اور اداسی کھدی ہوئی ہے۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ سوچتا ہے...."(۱۷)

انسانوں کا ایک اور المیہ غریب الوطنی ہے۔ اسے دیناوی ضروریات کی تکمیل کی کوشش کہیں یا لالچ لیکن ایک اور چیز جو انسانوں کے لیے تکلیف دہ عمل ہے وہ اپنوں کی جدائی ہے۔۔ کچھ لوگ تو واقعی زندگی کا سلسلہ برقرار رکھنے کے لیے محنت مزدوری کرنے بیرون ملک جاتے ہیں لیکن کچھ لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے محض زیادہ آمدن کے لیے بیرون ملک چلے جاتے ہیں اور دھرتی ماں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف وہ والدین ہیں جو بچوں کو پیدا کرتے ہیں، انھیں اچھی تعلیم دیتے ہیں، جوان کرتے ہیں، شادیاں کرتے ہیں اور انھیں کھو دیتے ہیں۔ دولت شہرت ،مقام و مرتبہ اور اولاد کا بہتر مستقبل تو ہے لیکن وہ سمندر پار بوڑھے والدین سے دور مقیم ہیں۔ دوسری طرف والدین بڑے بڑے محلات میں تو رہائش پذیر ہیں لیکن انھیں اولاد کا نہیں بلکہ تصویروں اور دیواروں کا ساتھ میسر ہے۔ ماہانہ خرچ، بروقت ادویات لینے کی ہدایت اور لیپ ٹاپ کے تصویری رشتے، کیا ان باتوں سے والدین کے جذبات کی تسکین ہو سکتی ہے؟ اولاد کا ساتھ، پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیوں کی کلکاریاں، یہ خلاء کیسے پر ہو۔ والدین بچوں کے دیس کیسے جائیں کہ پرندے تو شام کو گھروں کی طرف لوٹتے ہیں۔ ایک طرف آبادی میں اضافہ اور دوسری طرف انسانوں کی کمی، مقدر تنہائی۔ رشید امجد نے اپنے افسانوں میں ان والدین کے سسکتے بلکتے جذبات کو بھی بیان کیا ہے جو اپنے جگر گوشوں کے بغیر زندگی گزارتے ہیں۔ اپنے افسانے "تصویریں اور دیواریں" میں یوں نوحہ کناں ہیں۔

"بیٹے کو اس کی بات کی سمجھ نہ آئی۔ بولا۔ "تو یہاں آپ کے پاس کون ہو گا۔"

اس نے دیوار پر لگی بیٹوں اور ان کے بچوں کی تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے پاس یہ تصویریں ہیں۔"

اور سوچا "شاید یہی میرا مقدر ہے کہ تصویروں کے ساتھ رہوں اور دیواروں سے باتیں کروں۔"

اب وہ روز صبح ناشتہ کر کے اخبار پڑھتا ہے، پھر تصویروں کو دیکھتا رہتا ہے اور دیواروں سے باتیں کرتا رہتا ہے۔"(۱۸)

ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ اور جب مبلغ قاتل بن جائیں تو معاشرہ انسانیت کہاں سے تلاش کرے۔ ایک طرف تو معاشرہ تہذیب یافتہ ہونے کا دعویٰ کرے اور دوسری طرف انسانوں کو اس طرح قتل کیا جائے کہ لاش تو لاش لواحقین کو اپنے پیاروں کے لو تھڑے تک اٹھانا نصیب نہ ہوں۔ جب انسان ہی انسانوں کو کفن اور قبر کے تکلفات سے آزاد کر دیں تو احساس آدمیت کہاں سے تلاش کیا جائے۔ جب معاشرہ اس نہج پر پہنچ جائے کہ پورے خاندان کا بوجھ اٹھانے والا شخص رزق حلال کی تلاش میں سرگرداں ہو تو کسی بھی چوک چوراہے پر اس کے پرخچے اڑا دیئے جائیں۔ قاتل مقتول سب انجان اور جنت کے خواب، تو پھر انسانیت سرنگوں نہ ہو تو کیا کرے۔

"اپنی گاڑی کی طرف جاتے ہوئے اس نے سوچا، "سارا شہر ہی نشان زد ہے، پھر کون کس سے پوچھے اور کیا پوچھے؟"

جی چاہا قہقہہ لگائے۔۔۔ "ہم ہی قاتل ہم ہی مقتول، سو حساب برابر ہوا۔"

"سارے راستے بند ہیں، خود کردہ را علاج نیست۔"(۱۹)

رشید امجد کی کہانیاں پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک ماہر نباض کی طرح سماج کی ہر رگ سے واقف ہیں اور تمام سماجی طبقات کے بارے میں گہرا شعور رکھتے ہیں لیکن ایک طبقہ جس کا ذکر انھوں نے اپنے افسانوں میں بالخصوص کیا ہے وہ غریب طبقہ ہے۔ قد آور ادبی شخصیت کے حامل رشید امجد کا یہ ظرف ہے کہ وہ خود کو ایک عام آدمی تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غریب اور دکھی طبقے کے ہمدرد ہیں اور ان کے مسائل سے واقفیت بھی رکھتے ہیں۔ عام آدمی کی پریشانیوں کو پرکھنا، ان کے اسباب تلاش کرنا اور ان کا عمدہ بیان ان کی بنیادی خوبی ہے۔ رشید امجد کبھی تو اس سماج کے زخمی وجود کو اپنائیت سے اپنے ساتھ لپٹا لیتے ہیں اور کبھی سماج کی گرتی حویلی کے آنگن میں بیٹھ کر قاری کو اپنا شریک غم بنا لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں معاشرے کے مثبت پہلوؤں کا تذکرہ بھی موجود ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ معاشرے کے منفی کرداروں کو بھی بے نقاب کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی کہانیاں ظاہر کرتی ہیں کہ وہ معاشرے کے ایک ہمدرد فرد کی حیثیت سے معاشرتی زبوں حالی پر نوحہ کناں ہیں اور اس زبوں حالی کی اصلاح

کے خواہش مند بھی ہیں۔ ان کے افسانوں کا سب سے اہم کردار مرشد ہے اور یہ مرشد دراصل انسان کے ظاہری وجود کے اندر چھپا ہوا دوسرا انسان یعنی اس کا ضمیر ہے۔ جب انسان کے اندر کا وجود فوت ہو جائے تو اخلاق کے تمام پیمانے مذاق سے زیادہ کچھ اہمیت نہیں رکھتے اور وہ زبوں حالی انسان کا مقدر بنتی ہے کہ صاحب نظر لوگوں کو ہر طرف انسانی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ یہی آہیں، سسکیاں، دہائیاں اور فریادیں ان کی کہانیوں میں گونج رہی ہیں اور تقاضا کر رہی ہیں کہ انسان اپنے دامن پر موجود گرد کی جھاڑ پھونک کرے اور اپنے وجود پر موجود خود غرضی کے ان دھبوں کو اعلیٰ اخلاق کے برہوہ سے دھو ڈالے تاکہ کائنات کا حقیقی حسن دوبارہ بحال ہو سکے۔

حوالہ جات

۱۔ منشایاد، ایک عام آدمی کا خواب، مطبوعہ: جدید ادب، جرمنی، شمارہ ۸، ص ۳۷

۲۔ رشید امجد، "مشمولہ دکھ ایک چڑیا ہے" (راولپنڈی: پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء)، ص ۵۲۷

۳۔ رشید امجد، "پرانی آنکھوں سے دیکھنے کا آخری دن"، مشمولہ عام آدمی کے خواب، ص ۶۹۶

۴۔ رشید امجد، "سہ پہر کی خزاں"، مشمولہ عام آدمی کے خواب، ص ۲۹۰

۵۔ رشید امجد، "ایک مرحوم کی یاد میں"، مشمولہ عام آدمی کے خواب، ص ۸۲۲

۶۔ رشید امجد، "اضطراب شام تنہائی"، مشمولہ دکھ ایک چڑیا ہے، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن ۲۰۱۶ء)، ص ۵۸

۷۔ رشید امجد، "دل زندہ رہے"، مشمولہ عام آدمی کے خواب، ص ۵۰۷

۸۔ نوازش علی، ڈاکٹر، "رشید امجد کے افسانوں کی اسلوبیاتی اساس"، مشمولہ رشید امجد ایک مطالعہ، ترتیب و تعارف ڈاکٹر شفیق انجم، (راولپنڈی: نقش گر ۲۰۰۹ء) ص ۳۷

۹۔ رشید امجد، "ایک پرانی کہانی جسے دوبارہ لکھا گیا"، مشمولہ عام آدمی کے خواب، ص ۸۳۲

۱۰۔ رشید امجد، "جاتی رت کے خواب"، مشمولہ دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۰۴

۱۱۔ رشید امجد، "متلاہٹ"، مشمولہ ست رنگے پرندے کے تعاقب میں، (راولپنڈی: حرف اکیڈمی، ۲۰۰۲ء) ص ۱۳۸، ۱۳۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۱۳۔ رشید امجد، "خواب کے پیچھے پیچھے"، مشمولہ دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۰۹

۱۴۔ رشید امجد، "نوحہ"، مشمولہ ست رنگے پرندے کے تعاقب میں، ص ۱۰۰

۱۵۔ رشید امجد، "حسرت چشیدہ"، مشمولہ دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۰

۱۶۔ رشید امجد، "دریچے سے دور"، مشمولہ بھاگے ہے بیاباں مجھ سے، (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء) ص ۹۸

۱۷۔ رشید امجد، "خزاں دبے پاؤں آئی"، مشمولہ عام آدمی کے خواب، ص ۲۳۷

۱۸۔ رشید امجد، "تصویریں اور دیواریں"، مشمولہ دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۹۴

۱۹۔ رشید امجد، "دست گزیدہ"، مشمولہ دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۷

References in Roman Script

1. Mansha Yad, Ek Aam Admi ka Khawab, Matbooa: Jadid Adab, Germany, Shumara 8, Page 37.
2. Rasheed Amjad, Mashmoola Dukh ek Chiriya hy, (Rawalpindi: Poorab Academy, 2010, Page 752.
3. Rasheed Amjad, Purani Ankho sy Dekhny ka Akhri Din, Mashmoola Aam Admi key Khawab, Page 692
4. Rasheed Amjad, She Pehar ki Khizan, Mashmoola Aam Admi key Khawab, Page 290
5. Rasheed Amjad, Ek Marhoom ki Yad Main, Mashmoola Aam Admi key Khawab, Page 822
6. Rasheed Amjad, Iztirab Sham Tanhai, Mashmoola Dukh ek Chiriya Hy, Islamabad: National Book Foundation 2016, Page 58
7. Rasheed Amjad, Dil Zinda Rahy, Mashmoola Aam Admi key Khawab, Page 507
8. Nawazish Ali, Dr, Rasheed Amjad key Afsano ki Aslubiyati Asas, Mashmoola Rasheed Amjad ek Mutalia, Tarteeb wa Taruf Dr. Shafique Anjum, Rawalpindi, Naqsh gar 2009, Page 73
9. Rasheed Amjad, Ek Purani Kahani Jissy Dobara Likha Gea, Mashmoola Aam Admi key Khawab, Page 832
10. Rasheed Amjad, Jati Rut k Khawab, Mashmoola Dukh ek Chirya hy, Page 104
11. Rasheed Amjad, Matlajat, Mashmoola Sat Rangy Parinday key Taqub main, Rawalpindi: Harf Academy, 2002, Page 137-138
12. Ibid, Page 138
13. Rasheed Amjad, Khawab key Pechy Pechy, Mashmoola Dukh ek Chirya Hay, Page 109
14. Rasheed Amjad, Noha, Mashmoola Sat Rangy Parandey key Taqub Main, Page 100

15. Rasheed Amjad, Hasrat Chasheda, Mashmoola Dukh ek Chirya Hay, Page 10
16. Rasheed Amjad, Darechy sy door, Mashmoola Bhagy hay Biyaban Mujh sy, Lahore, : Maqbool Academy 198, Page 98
17. Rasheed Amjad, Khiza Daby Pao Aai, Mashmoola Aam Admi key Khawab, Page 723
18. Rasheed Amjad, Taswerain or Dewarain, Mashmoola Dukh ek Chirya hay, Page 94
19. Rasheed Amjad, Dast Gazida, Mashmoola Dukh ek Chirya hay, Page 17